Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 7, Issue 1
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com
Research Article

عامر علی
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اردو، مسلم یوتھ یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر قیصر آفتاب احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مسلم یوتھ یونیورسٹی، اسلام آباد

انیسویں صدی کے منتخب ناولوں میں خوف کے نفسیاتی عوامل؛ تجزیاتی مطالعہ

Aamir Ali
PhD Scholar, Department of Urdu, Muslim Youth University, Islamabad
Dr. Qaisar Aftab Ahmed
Assistant Professor, Department of Urdu, Muslim Youth University, Islamabad

Received: Jan08, 2026
Accepted: Jan27, 2026
Published: Mar30, 2026

Psychological Factors Of Fear In Selected Nineteenth-Century Urdu Novels: An Analytical Study

This article presents an analytical study of the psychological factors of fear in selected nineteenth-century Urdu novels. It explores fear as a natural human emotion shaped by personal experiences, social conditions, cultural beliefs, and religious values. The study focuses on four major novels: *Taubat-un-Nasuh* by Deputy Nazir Ahmad, *Fasana-e-Azad* by Ratan Nath Sarshar, *Umrao Jan Ada* by Mirza Hadi Ruswa, and *Firdaus-e-Bareen* by Abdul Halim Sharar. The analysis demonstrates that these novels portray various forms of fear, including fear of death, disease, insecurity, social disgrace, superstition, darkness, loneliness, and divine punishment. Such fears significantly influence the characters' thoughts, emotions, and actions, often leading them towards repentance, moral reform, or psychological conflict. The study concludes that nineteenth-century Urdu novelists skillfully represented the psychological dimensions of fear and used them to reveal the complex relationship between individual consciousness and the changing social and cultural realities of their time. Thus, fear emerges as a central psychological force in the development of character and narrative.

Key Words: Fear, Psychology, Urdu Novel, Nineteenth-Century Urdu Literature, Psychological Factors, Characterization, Social Anxiety, Moral Transformation.

انسان معاشرے میں اچھی اور بری، موافق اور ناموافق، پسندیدہ اور ناپسند کی جانی والی کیفیات اور سماجی و بشری عوامل سے گزرتا رہتا ہے۔ جب

انسان کسی ایسی ناموافق صورت حال کا سامنا کرے یا کسی ایسی کیفیت کے جنم لینے کا خدشہ ہو تو فطری طور پر انسان کے اندر خوف جنم لیتا ہے۔ گویا خوف ایک ایسی انسانی کیفیت ہے جو خطرے یا ممکنہ نقصان کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ خوف کا عنصر دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور جسم کو ممکنہ نتائج کے برے پہلو سے آگاہ کرتا ہے۔ بقول محمد یونس حسرت:

"خوف کا جذبہ حیات انسانی میں ایک فطری مقام رکھتا ہے۔ اس کی بنیاد کسی حقیقی سبب پر ہوتی ہے۔ خوف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی شخص یا ماحول کی کسی صورت حال کی بدولت خطرے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایسے میں فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے وجود کو بعض خارجی قوتوں یا اشیا سے خطرہ لاحق ہے اور اس صورت حال پر اس کا رد عمل خوف کے جذبے کے ساتھ بروئے کار آتا ہے۔"(۱)

خوف کا تعلق انسان کے ماضی کے تجربات، مشاہدات اور تصورات سے ہے۔ ایک ہی کیفیت ایک انسان کے لیے خوف کا باعث بن سکتی ہے جبکہ دوسرا اس سے خوف نہیں کھاتا۔ اگر انسان کے ماضی میں کوئی کیفیت کسی منفی نتیجے پہ منتج ہو تو انسان کے اندر اس کیفیت اور اس نتیجے کے مستقل تعلق کا رجحان قوی ہو جاتا ہے۔ یوں انسان جب بھی اس جیسی کیفیت سے کبھی دوچار ہوتا ہے تو ماضی کے تلخ نتائج کی وجہ سے اس کے اندر خوف پیدا ہونے لگتا ہے۔ گویا یہ کہنا بجا ہے کہ ہر خوف انسان کی فطرت کا حصہ نہیں بلکہ بہت سے خوف انسان کے ماضی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ای اے مینڈرر قمطراز ہیں:

"تمام خوف فطری نہیں ہیں بلکہ ہر آدمی کے ساتھ اس کی اپنی زندگی میں مثال، معلومات یا ذاتی تجربے کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔"(۲)

خوف ہمیں محفوظ رکھنے کا قدرتی طریقہ کار بھی ہے۔ اعتدال میں خوف ہماری حفاظت کرتا ہے اور ہمیں محتاط بناتا ہے۔ لیکن زیادہ خوف پریشانی یا فوبیا کا سبب بن سکتا ہے۔ اسے سمجھ کر ہم اس پر قابو پا سکتے ہیں اور زندگی میں بہتر فیصلے کر سکتے ہیں۔ خوف سے سیکھنا بھی ممکن ہے اور یہ جذبہ انسانی زندگی میں احتیاط کی صورت حال کو بھی تقویت دیتا ہے۔ بقول:

"خوف کے سلسلے میں ایک اور چیز کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا ضروری ہے۔ وہ چیز احتیاط ہے۔ "خوف" اور "احتیاط" کا خلط ملط یقیناً نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ خوف کے لیے کوئی خطرہ بھی ہو۔ مگر احتیاط خطرے کے احساس کا نام ہے۔"(۳)

خوف کے نتیجے میں جنم لینے والے اس مثبت رد عمل کی نشاندہی کرتے ہوئے محمد یونس حسرت لکھتے ہیں:

"(خوف کی وجہ سے) جذبہ عمل کے لیے تڑپ بڑھ جاتی ہے اور نامساعد حالات کے خلاف قوت مدافعت پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ فطری خوف میں جب صحت مندانہ شدت پیدا ہوتی ہے تو لوگ ہمت و جرات کے ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں جو عام حالات میں ان کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتے ہیں۔"(۴)

انیسویں صدی کا اواخر اردو ناول نگاری کا عہد طفولیت ہی نہیں بلکہ ایک بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور تہذیبی شعور کا دور بھی تھا۔ اس دور میں داستانوی سحر ٹوٹ رہا تھا اور زندگی اپنی تلخ حقیقتوں کے ساتھ ادب کا حصہ بن رہی تھی۔ اس دور کے ناول نگاروں نے جہاں زوال آمادہ معاشرت اور اقدار کی شکست و ریخت کی عکاسی کی وہاں انہوں نے انسانی ذہن کی اندرونی تہوں اور اس میں رچے بسے خوف کے نفسیاتی عوامل کو بھی اپنے اسلوب کا محور بنایا۔ بقول صالحہ زریں:

"اس وقت کا ہندوستان۔۔ قدیم تہذیب کی رخصت اور نئی تہذیب کی آمد کی کشمکش اور تصادم میں گرفتار تھا۔ سماج انگڑائیاں لے رہا تھا۔ روایتی مزاج کے لوگ اپنی شان و شوکت کی دفاع اور تعلیم یافتہ طبقہ نئی تہذیب اور روشن اقدار کے استقبال میں مصروف تھا۔ بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ بہت کچھ بدل رہا تھا۔"(۵)

اس عہد نے نمائندہ ناولوں میں خوف کے ان عناصر کو دیکھا جائے تو ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "توبۃ النصوح" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار "نصوح" دہلی میں پھیلی ہیضے کی وبا کا شکار ہوتا ہے۔ دوا کے اثر سے وہ خواب میں موت کے بعد سزا و جزا کے خوفناک مناظر دیکھتا ہے۔ بیدار ہونے پر وہ سچی توبہ کرتا ہے اور اپنے خاندان کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ اس کے چھوٹے بچے راہ راست پر آ جاتے ہیں، لیکن بڑا بیٹا "کلیم" اور بڑی بیٹی "نعیمہ" سرکشی دکھاتے ہیں۔ کلیم گھر چھوڑ دیتا ہے، مختلف مصائب اور جیل کی ہوا کھانے کے بعد آخر کار زخمی حالت میں توبہ کر کے دم توڑ دیتا ہے۔ ہیضے کی ناگہانی وبا معاشرے میں بے یقینی اور اضطراب پیدا کرتی ہے۔ نصوح جب اپنے رشتہ داروں کو مرتے دیکھتا ہے تو وہ جسمانی کمزوری کے ساتھ ساتھ شدید ذہنی ڈپریشن اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ موت کا یہ خوف اسے اپنی جائیداد اور ادھوری خواہشات کے چھن جانے کے احساس سے ڈراتا ہے جو آخر کار اس کی شخصیت میں تبدیلی کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ بقول اشفاق احمد اعظمی:

"ہیضے کی وبا اور انسان کی زندگی پر اس کے اثرات اور دل و دماغ کا ایسی حالتوں میں مفلوج ہو جانے کا بیان اتنا مکمل اور دلکش ہے کہ اردو ایسی مثال آج بھی ملنا مشکل ہے۔ اس ناول کی تصنیف سے کچھ عرصہ پہلے دہلی شہر میں ایسے ہی ایک ہیبت ناک ہیضہ کا سراغ ملتا ہے جس میں شہری زندگی کا بالکل انقطاع ہو گیا تھا۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔"(٦)

نصوح کو اپنی موت سے زیادہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کے مستقبل کا خوف ستاتا ہے۔ اسے معاشی بے یقینی اور بیٹوں کی نااہلی کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کے خاندان کا کیا بنے گا۔ یہ خوف ظاہر کرتا ہے کہ نصوح حال سے کٹ کر مستقبل کی فکر میں گھل رہا تھا۔ خواب کے منظر میں جب نصوح خود کو قبر کی حوالات میں اکیلا پاتا ہے تو تنہائی کا خوف اس پر طاری ہو جاتا ہے۔ تاہم، وہ دوزخ کی ہولناک سزا کے مقابلے میں قبر کی اس تنہائی کو غنیمت اور آرام دہ سمجھ کر قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خواب میں اپنے برے اعمال (جیسے نماز نہ پڑھنا اور شرک) کا حساب دیکھنے کے بعد نصوح کے اندر شدید ندامت اور احساس گناہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی خوفِ خدا اسے دنیاوی عیش و عشرت سے دور کر کے نیک اعمال اور دین داری کی طرف راغب کرتا ہے۔ ناول کے دیباچہ میں ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

"خواب جو نصوح نے دیکھا تمام قصہ کی جان ہے۔ حشر اور اعمال نامہ اور حساب قبر کی تکلیف اور دوزخ کا عذاب یعنی قیامت کے حالات جن کا وہ مذہب اسلام کے مطابق معتقد تھا۔ خواب میں اس کو واقعات نفس الامری دکھائی دیے۔ جاگا تو خائف و ہراساں، بیدار ہوا تو ترساں ولرزاں۔ خوف کا نتیجہ و ہراس کا اثر جو نصوح پر مرتب ہوا قصے کے پڑھنے سے ظاہر ہو گا۔"(٧)

نصوح اپنی بڑی اولاد کی نافرمانی اور آوارگی دیکھ کر اس بدگمانی کا شکار ہو جاتا ہے کہ اب ان کی اصلاح ناممکن ہے اور اسے معاشرے میں رسوائی اٹھانی پڑے گی۔ یہ مایوسی اس کے اعصاب پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی طرح ناول میں دکھایا گیا ہے کہ بچپن کا ڈر انسان کے لاشعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ جب فہمیدہ اپنی چھوٹی بیٹی حمیدہ کو خدا کے غضب سے ڈراتی ہے تو وہ سہم جاتی ہے۔ یہ نفسیاتی نکتہ واضح کرتا ہے کہ بچپن میں بٹھایا گیا خوف انسان کے ساتھ عمر بھر رہتا ہے۔ نصوح کا چھوٹا بیٹا سلیم اپنے بڑے بھائی کلیم کے ظلم اور مار پیٹ کے خوف سے ہمیشہ سہم کر رہتا ہے۔ یہ خوف اس کی ذہنی و جسمانی نشو و نما کو متاثر کرتا ہے اور وہ ایک گھٹن زدہ ماحول میں جینے پر مجبور ہوتا ہے۔ بڑی بیٹی نعیمہ اپنے سسرال سے نکالے جانے کے بعد شدید ذہنی تناؤ اور غصے کا شکار ہے۔ جب اس کی ماں اسے تھپڑ مارتی ہے تو وہ اپنے ہی معصوم بچے کو بے دردی سے پیٹنا شروع کر دیتی ہے۔ مار پیٹ کے حوالے سے خوف کی کیفیت ناول کے اس اقتباس سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے:

"باپ: تم کو خوف ہی تھا یا تم کو بڑے بھائی نے کبھی مارا بھی تھا۔"
بیٹا: "اس کی گنتی نہ میں بتا سکتا ہوں اور نہ بڑے بھائی جان بتا سکتے ہیں۔"
باپ: "کس بات پر؟"
بیٹا: "میں نے تو ہمیشہ ان کے مارنے کو ناحق، بے سبب، بے قصور اور بے خطا ہی سمجھا۔"(٨)

ناول میں خان صاحب کا کردار اس خوف کی عکاسی کرتا ہے جہاں انسان معاشرے میں اپنی بدنامی یا بے عزتی برداشت نہیں کر پاتا۔ بنیے کے ذریعے بازار میں ذلیل کیے جانے پر وہ طیش میں آ کر قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اپنی عزت نفس کا شدید خوف ہوتا ہے۔ اسی طرح علیم کو یہ خوف ہوتا ہے کہ کلیم کی ضد کی وجہ سے گھر کا امن برباد ہو جائے گا اور محلے میں رسوائی ہو گی۔ اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیے:

"وہ شخص جن پر ڈگری جاری تھی، غریب تو تھا، لیکن غیرت مند بھی تھا۔ بنیے نے جو عزت اتروانے کا نام لیا، سُرخ ہو گیا اور گھر میں گھس، تلوار میان سے نکال چاہتا تھا کہ بنیے کا سر الگ کر دے کہ اس کی بیوی اس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی۔ ''خدا کے لیے کیا غضب کرتے ہو۔ یہی تمہارا غصہ ہے تو پہلے مجھ پر اور بچوں پر ہاتھ صاف کرو۔ کیوں کہ تمہارے بعد ہمارا تو کہیں بھی ٹھکانہ نہیں"۔۔۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر خان صاحب بھی ٹھنڈے ہوئے اور تلوار کو میان میں رکھ کر کھونٹی سے لٹکا دیا اور بی بی سے کہا: "اچھا تو نیک بخت مجھ کو اس بے عزتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔"(٩)

انیسویں صدی کی اردو ناول کی روایت میں رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانہ آزاد" ایک کلاسیکی سرمایہ ہے۔ یہ ناول لکھنوی تہذیب، طوائف پرستی، زوال آمادہ معاشرت اور قسط وار داستانی اسلوب کا آئینہ دار ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار "میاں آزاد" ایک ذہین اور بہادر شخص ہے۔ وہ اپنی محبوبہ "حسن آرا" کی شرط پر روس کے خلاف ترکوں کی مدد کے لیے جہاد پر نکلتا ہے۔ ناول کا دوسرا سب سے مشہور اور لافانی کردار "خوجی" ہے جو افیم کا عادی، پست قامت،

ناتواں لیکن انتہائی چالاک، مغرور اور مزاحیہ شخصیت کا حامل ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر ان دونوں کے سفر، مہم جوئی اور لکھنؤ سے قسطنطنیہ (ترکی) تک کے حالات کی روداد ہے۔ بقول صالحہ زریں:

"میاں آزاد لکھنو کی اعلیٰ خاندان کی دوشیزہ حسن آرا کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حسن آرا میاں آزاد کا امتحان لینے کے لئے ترکی میں روسیوں کے خلاف جنگ میں شرکت کی تجویز پیش کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں تمہیں سچا عاشق تبھی سمجھوں گی جب تم روس کے خلاف جنگ کرو گے۔ اور اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرو گے۔ اگر جنگ میں کامیابی حاصل کر کے آؤ گے تو شادی کروں گی۔ مارے گئے تو شہادت پاؤ گے۔ یہ بات میاں آزاد کے دل پر اثر کر گئی اور وہ اپنے ساتھ خوجی کو لے کر ترکی چلے گئے۔ روس کے خلاف جنگ لڑی۔ لکھنو کامیاب ہو کر لوٹے۔ اور حسن آرا سے شادی کر لی۔ یہ دونوں میاں بیوی سماجی اور اصلاحی کاموں میں منہمک ہو گئے۔ اس مختصر سے قصے کو طویل کر کے سرشار نے چار جلدوں میں کر دیا۔"(۱۰)

اس ناول میں سرشار نے لکھنوی معاشرے کی ظاہری رنگینی کے پیچھے چھپے درج ذیل نفسیاتی ڈر اور رویوں کو بے نقاب کیا ہے۔ انھوں نے نشے کی لعنت کو ایک نفسیاتی ڈر کے طور پر پیش کیا ہے۔ جب افیم کے عادی شخص (جیسے خوجی یا ترکی میں ملنے والے افیمی) کو وقت پر نشہ نہیں ملتا تو اس پر موت کی مردنی چھا جاتی ہے۔ اعصاب سن ہو جاتے ہیں اور اسے لگتا ہے کہ وہ اب مر جائے گا۔ یہ موت کا خوف اسے لوگوں کے سامنے گڑگڑانے اور نشے کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس پس منظر میں ناول سے ایک اقتباس دیکھیے:

"اس نے کانکھ کانکھ کر آہستہ سے کہا یارو میں تو مر مٹا، بھائی کہیں سے پانچ پچھے ٹکے کی افیون لے آو۔ اب تو آنکھیں کھل جائیں۔ جان میں جان آئے۔ وقت نہ ملے تو نزع کی حالت پہنچے۔"(۱۱)

لکھنوی تہذیب میں جن، چڑیل اور بھوت پریت کا خوف لاشعور کا حصہ تھا۔ بچپن میں ڈرانے کے لیے سنائی گئی کہانیاں بڑے ہو کر بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ناول کے کردار معمولی بندر یا چڑیل کے تصور سے ہی خوفزدہ ہو کر اپنی روح فنا کر بیٹھتے ہیں۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ توہم پرستی انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیتی ہے۔ اس پس منظر میں ناول سے ایک اقتباس دیکھیے:

"رات کو درخت کی پھنگی پر بندر دیکھا اور روح فنا ہو گئی کہ پریت جھانک رہا ہے۔ بولے اور ٹٹوالیا، کلبلائے اور گلا دبوچا۔ ذرا ہلے اور شامت آئی۔۔ اور جو بھوت پریت کا خیال آیا جم گیا تو ساری چوکڑی بھول گئے۔"(۱۲)

ناول میں جب محلے میں "چور چور" کا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے تو لوگ اصل حقیقت جانے بغیر چور کے خوف سے آنکھیں بند کر کے سہم جاتے ہیں یا ہڑبونگ مچا دیتے ہیں۔ یہ عوامی سطح پر پھیلے خوف کی نفسیات کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح پولیس کا خوف بھی ناول میں عیاں ہے۔ جب میاں آزاد کو ایک برقنداز (سپاہی) آ کر بتاتا ہے کہ تھانیدار نے بلایا ہے تو ان کا سارا تماشا اور لطف کرکرا ہو جاتا ہے۔ انہیں یہ نفسیاتی خوف ستاتا ہے کہ تھانے جانے سے لوگ انہیں مجرم سمجھیں گے اور ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیے:

"چور نہیں کہ کوتوال سے ڈروں، جواری نہیں کہ پیاری کی صورت دیکھ کر جان نکلے۔ دوڑ کو خوف ہو، بدمعاش نہیں کہ منہ چھپاؤں۔"(۱۳)

اس عہد کا ایک اور اہم ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا یہ شاہکار ناول اردو ادب کا پہلا نفسیاتی ناول مانا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک طوائف کی کہانی نہیں بلکہ مٹتی ہوئی لکھنوی تہذیب اور نظام انصاف کا مرثیہ ہے۔ کہانی کا پلاٹ ایک معصوم لڑکی "امیرن" (امراؤ جان) کے گرد گھومتا ہے جسے فیض آباد سے دلاور خان نامی مجرم اپنے پرانے بدلے کی خاطر اغوا کر کے لکھنؤ میں خانم کے کوٹھے پر سو روپے میں بیچ دیتا ہے۔

مرزا ہادی رسوا نے "امراؤ جان ادا" کے ذریعے اس سماج خوف کے متعدد گہرے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو انسانی لاشعور کی تعمیر میں بچپن کے حالات اہم ہوتے ہیں۔ ناول میں امراؤ جان کے ذہن پر اس کی والدہ کی سخت گیری اور مار پیٹ کا گہرا ڈر تھا۔ چھوٹے بھائی کو زیادہ پیار ملنے اور اپنی معمولی غلطیوں پر سخت سزا پانے کی وجہ سے امیرن کے اندر بچپن ہی سے احساس کمتری اور خوف پیدا ہو گیا تھا جو عمر بھر اس کی شخصیت کا حصہ رہا۔ اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیے:

"اماں ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں، جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ رونے لگا۔ اماں یہ سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا۔"(۱۴)

جب دلاور خان امراو جان ادا کو اغوا کر کے لے جاتا ہے تو وہ بار بار اسے چمکتی ہوئی چھری دکھا کر گلا کاٹنے کی دھمکی دیتا ہے۔ موت کا یہ خوف اس معصوم بچی پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی۔ جب دلاور خان اسے مار کر نالے میں پھینکنے کی بات کرتا ہے تو یہ شدید خوف اس کے اعصاب کو عمر بھر کے لیے مفلوج کر دیتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس دیکھیے:

"یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خان گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہو گی۔ گو ڈراب میرے منھ میں نہ تھا مگر ڈر کے مارے میرے منھ میں آواز نہ نکلتی تھی۔"(۱۵)

امراؤ جان پیدائشی طور پر طوائف نہیں تھی بلکہ ایک شریف گھرانے کی بیٹی تھی جسے زبردستی اس پیشے میں دھکیلا گیا۔ اس لیے وہ بازاری زندگی کے درندوں، ہوس پرستوں اور منافقوں کے بیچ ہمیشہ شدید عدم تحفظ کا شکار رہی۔ وہ ایک گھریلو عورت بن کر چار دیواری کا تحفظ چاہتی تھی لیکن معاشرہ اسے قبول نہیں کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ تاحیات متضاد کیفیات اور ذہنی کشمکش کا شکار رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ناول عدم تحفظ کے خوف کو متعدد مقامات پر مختلف انداز میں اجاگر کرتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر راحیلہ رقمطراز ہیں:

"چونکہ وہ خاندانی لڑکی تھی پیدائشی طور پر طوائف نہ تھی اس لیے شروع سے آخر تک وہ متضاد کیفیت کا شکار رہی۔ بعض مقامات پر وہ اس خواہش کا اظہار بھی کرتی ہے کہ تمام طوائفوں کے چاہنے والے صرف اور صرف مجھے دیکھیں اور مجھے چاہیں مگر دوسری طرف سے توبہ تائب ہو کر باعزت زندگی گزارنے کی خواہش مند ہے۔"(۱۶)

"امراؤ جان ادا" میں تاریکی اور اندھیرے کے خوف کی انسان کی فطری صورت حال بھی دکھائی دیتی ہے۔ امراؤ جب بیگم صاحبہ کے ہاں جاتی ہے تو رات کے وقت درختوں کا بھیانک نظر آنا، ہوا کی سائیں سائیں اور اندھیرا اس کا کلیجہ دہلا دیتا ہے۔ دراصل یہ اندھیرے کا خوف اس کے لاشعور میں بچپن کے اس تلخ واقعے سے جڑا تھا جب دلاور خان نے اسے ایک اندھیری ٹھنڈی رات میں اغوا کیا تھا۔ بچپن کا یہ سفاک تجربہ اس کے ذہن میں رات اور اندھیرے کو خوف کی علامت بنا دیتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہُو کا عالم تھا۔ کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ اب مارے دہشت کے یہ سماں تھا کہ کسی کے منھ سے بات نہیں نکلتی تھی۔"(۱۷)

مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول "فردوسِ بریں" اردو کا ایک بہترین تاریخی و تہذیبی ناول ہے جس میں لکھنوی معاشرت کی داستانی رنگینی اور سحر انگیز اسلوب پایا جاتا ہے۔ یہ ناول نو (9) ابواب پر مشتمل ہے جس کا مرکزی موضوع فرقہ باطنیہ (حسن بن صباح کے پیروکاروں) کے گمراہ کن عقائد، ان کی مصنوعی جنت اور ان کی خفیہ ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار "حسین" اور "زمرد" ہیں جو حج کے سفر پر نکلتے ہیں لیکن راستے میں زمرد کو باطنیہ فرقے کے لوگ اغوا کر لیتے ہیں اور حسین کو یقین دلایا جاتا ہے کہ پریاں اسے آسمان (جنت) پر لے گئی ہیں۔ حسین اپنی محبوبہ کے حصول کی خاطر ان کے چنگل میں پھنس جاتا ہے اور ان کے اشارے پر اپنے استاد (نجم الدین نیشاپوری) تک کو قتل کر دیتا ہے۔ بالآخر "بلغان خاتون" کی مدد سے اس قلعے (الموت) اور نقلی جنت کو تباہ کیا جاتا ہے اور سچی حقیقت سامنے آنے پر دونوں تائب ہو کر ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہیں۔ بقول سید وقار عظیم:

"فردوس بریں" کے قصے کا موضوع فرقہ باطنیہ کا وہ طوفان بلاخیز ہے جو پانچویں صدی میں دنیائے اسلام کے لیے ایک فتنہ بن کر آیا اور شباب کی انتہائی بلندیوں کو پہنچ کر اسی طرح ختم ہوا جیسے ہر طوفان ختم ہوتا ہے۔"(۱۸)

عبدالحلیم شرر نے اپنے اس ناول کی کہانی کے تانے بانے میں انسانی نفسیات اور خوف کے متعدد اہم محرکات کو واضح کیا ہے۔ ان میں روایتی قصوں اور پریوں کی وجہ سے موت کا خوف سر فہرست ہے۔ ناول کے آغاز میں جب حسین اور زمرد ایک ویران گھاٹی سے گزرتے ہیں تو ان کے ذہنوں پر عوام سے سنی سنائی توہمات اور کہانیاں سوار ہوتی ہیں کہ یہاں پریاں رہتی ہیں جو اکیلے انسان کو مار دیتی ہیں۔ یہ خوف ان کی نفسیات پر اس حد تک غالب آ جاتا ہے کہ رات کے وقت جب وہ کچھ مشعلیں اور عورتوں کا غول دیکھتے ہیں تو پریوں کے اسی خوف سے ان کا پِتہ پانی ہو جاتا ہے اور دونوں چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ناول "فردوس بریں" ایک اقتباس دیکھیے:

"دونوں عاشق معشوق روشنی کو ٹھہرا کے اور ساعت بہ ساعت زیادہ متحیر ہو کر دیکھ رہے تھے کہ وہ بالکل قریب آ گئی۔ بڑی بڑی پندرہ بیس مشعلیں تھیں اور ان کے نیچے حسین و پری جمال عورتوں کا ایک بڑا سا غول، جن کی صورت دیکھتے ہی زمرد اور حسین دونوں نے ایک چیخ ماری۔ دہشت زدگی کی آواز میں دونوں کی زبان سے نکلا "پریاں" اور دونوں غش کھا کر بے ہوش ہو گئے۔"(۱۹)

جدائی کا غم انسان کو نفسیاتی طور پر بیمار کر دیتا ہے۔ زمرد کے غائب ہونے کے بعد حسین شدید تنہائی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں تنہائی کا خوف اس کے اندر ایک عجیب قسم کی دیوانگی اور پیام مرگ (موت) کا انتظار پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک منظر میں جب حسین کو کوہ وجودی کی تاریک غاروں اور پہاڑیوں سے نیچے اتر کر انبیاء کے جنازے دیکھنے کا کہا جاتا ہے تو رات کی گہری تاریکی اس کے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ شوق منزل کے باوجود اندھیرے کے ڈر سے اس کے پاؤں کانپتے ہیں اور دل دھڑکتا ہے۔ تاریکی اور پراسرار ماحول کا یہ نفسیاتی دباؤ بالآخر اسے چکرا کر گرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس پس منظر میں ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور دل دھڑکتا تھا، تاہم زمرد کا شوق ان تمام کمزوریوں پر غالب آگیا۔۔ حسین یہ مقدس ہیرے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ گیا اسے کسی طرح قدم آگے بڑھانے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔"(۲۰)

یہ اس ناول کا سب سے طاقتور نفسیاتی پہلو ہے۔ حسین اپنی محبوبہ زمرد کو پانے کے اندھے جنون میں شیخ وجودی کے کہنے پر اپنے معصوم چچا اور استاد کا قتل تو کر دیتا ہے لیکن جرم کے فوراً بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ اسے شدید روحانی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوزخ و عذاب کا خوف اس کے ایمان کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ زبان پر بار بار "میں بڑا گنہگار ہوں" کے الفاظ آنا اس کے شدید نفسیاتی پچھتاوے اور خدا کے غضب کے ڈر کو ظاہر کرتا ہے۔

جب حسین کو قلعے میں امام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس کی گستاخی پر سزا کا حکم ہونے لگتا ہے تو وہ اپنی بے بسی کے باعث زمین پر گر کر رو رو کر معافی مانگنے لگتا ہے۔ اسے یہ خوف ستاتا ہے کہ وہ نہ صرف زمرد کے وصال سے محروم ہو گیا ہے بلکہ اپنے گناہوں کی وجہ سے رحمتِ باری تعالیٰ اور نجات سرمدی (ہمیشہ کی نجات) سے بھی دور ہو چکا ہے۔ یہ مایوسی اس کی نفسیاتی الجھن کو انتہا پر پہنچا دیتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"اس وقت اس کا حواس ذرا ٹھکانے ہوئے اور اپنا ظلم و گناہ یاد آیا جو ہر پہلو سے برا نظر آتا تھا۔ اس کے خیال کے مٹانے کی برابر کوشش کرتا تھا مگر بار بار زبان سے ایک آہ کے ساتھ یہ سلسلہ نکل آتا تھا کہ '' میں بڑا گنہ گار ہوں'' اس ناول اس کے ایمان پر لعنت کر رہا تھا۔۔ تو بے شک میں دوزخ اور عذاب سے نہ بچ سکوں گا۔ الغرض خوف حسین کے دل نے اُسے قائل کیا کہ اب وہ پچھتا رہا ہے اور سخت روحانی تکلیف میں مبتلا ہے۔"(۲۱)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انیسویں صدی کے ان نمائندہ اردو ناولوں میں یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانی رویوں، فیصلوں اور جذباتی نشیب و فراز کی تشکیل میں خوف کے نفسیاتی عوامل کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا اور عبدالحلیم شرر نے اپنے مخصوص تہذیبی و داستانی اسلوب میں انسانی لاشعور کی تہوں میں چھپے ہوئے فطری اور معاشرتی ڈر کو انتہائی مہارت سے بے نقاب کیا ہے۔ ان ناولوں میں بچپن کے تلخ تجربات اور والدین کی سخت گیری جہاں کرداروں کو تاحیات احساس کمتری اور عدم تحفظ کے جال میں پھنسائے رکھتی ہے وہاں موت کا عالمگیر خوف، توہم پرستی اور رات کا اندھیرا انسان کو ذہنی و اعصابی طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ اسی طرح بیماری کی ناامیدی، تنہائی کا ہجر اور سب سے بڑھ کر احساس گناہ کے باعث پیدا ہونے والا دوزخ اور خدا کا خوف کرداروں کو شدید ذہنی تضاد اور صدمات سے گزار کر بالآخر توبہ اور سدھار کی طرف مائل کرتا ہے۔ یوں یہ چاروں شاہکار ادبی فن پارے یہ فطری اور نفسیاتی سچ ثابت کرتے ہیں کہ انسان خواہ کتنا ہی بہادر یا مہم جو کیوں نہ ہو اس کے اندر کا خوف اور معاشرتی عدم تحفظ اس کی شخصیت کو مسلسل ایک ذہنی کشمکش اور اضطرابی کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد یونس حسرت، ہمارے نفسیاتی خوف، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۵۔۶

۲۔ ای اے مینڈر، ہماری نفسیات، ترجمہ، شید احمد، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۲۳

۳۔ شیر محمد اختر، بچوں کی نفسیات، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد (دکن)، س ن، ص ۸۷

۴۔ محمد یونس حسرت، ہمارے نفسیاتی خوف، ص ۶

۵۔ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، سرسوتی پریس، الہ آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۸۷

۶۔ اشفاق احمد اعظمی، توبۃ النصوح؛ فکری اور فنی جائزہ، مشمولہ، شیرازہ، مطبوعہ، جے کے آفیسٹ پریس، دہلی، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۱۲، ۱۱، ص ۴۶

۷۔ نذیر احمد، ڈپٹی، مقدمہ، توبۃ النصوح، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۵

۸۔ نذیر احمد، توبۃ النصوح، ص ۹۲

۹۔ ایضاً، ص۱۱۴۔۱۱۵

۱۰۔ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ص۷۸

۱۱۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص۱۷۵

۱۲۔ ایضاً، ص۱۹۵

۱۳۔ ایضاً، ص۳۱۲

۱۴۔ ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، کزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص۳۸

۱۶۔ راحیلہ، ڈاکٹر، ناول "امراؤ جان ادا" کا نفسیاتی تجزیہ، مشمولہ، جرنل آف ریسرچ، شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۳۵، ۱۹۹۹ء، ص۵۰

۱۷۔ ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، ص۱۵۲۔۱۵۸

۱۸۔ وقار عظیم، سید، مقدمہ، فردوس بریں، عبدالحلیم شرر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص۷

۱۹۔ عبدالحلیم شرر، فردوس بریں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص۵۶

۲۰۔ ایضاً، ص۷۱۔۷۲

۲۱۔ ایضاً، ص۹۶۔۹۹